مغرب اور سیاسی خدشات

ڈاکٹر انیس احمد

اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جو فکری پریشانیاں مغرب کو درپیش ہیں غالباً ان میں سرفہرست ایک "مذہبی ریاست" THeocracy کے قیام کا امکان ہے ۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چاہے وہ الجزائر ہو' ایران ہو' ترکی ہو' بوسنیا ہرزیگوینا ہو یا اسلامی جمہوریہ پاکستان' اسلام کی بنیاد پر کسی سیاسی تبدیلی کی شروعات ہی مغربی مفکرین اور ارباب سیاست کو مذہب پر مبنی سیاسی اقتدار کے تصور سے متفکر بلکہ متوحش کر دیتی ہیں۔ اس فکر اور پریشانی کا تعلق محض ان مفکرین کے ساتھ نہیں ہے جو بعض مغربی ممالک میں ارباب سیاست کے مشیروں کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ایسے محققین بھی اس فہرست میں شامل ہیں جنہیں بالعموم اسلام دوست یا کم از کم غیر جانبدار کہا جاتا ہے۔ مثلاً ہملٹن گب اپنی کتاب Modern trends in Islam ۱۹۴۷ء میں' کینٹول سمتھ Islam in Modern History ۱۹۵۷ء میں یا جان ایسپوزیٹو Islam and Politics ۱۹۹۱ء میں دور جدید کی اسلامی احیائی تحریکوں اور اسلامی ریاست کے قیام کی کوششوں کا تجزیہ اسی سیاق وسباق میں کرتے ہیں۔

مغرب کے ان خدشات اور ان سے وابستہ مذہبی جنونیت کے خوف کو ایک محدود اور اقلیتی فکر کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مغربی ذہن میں ان خدشات کا وجود ہے تو ہمیں معروضی طور پر یہ کوشش کرنی ہو گی کہ ان پیدا ہونے والے خدشات کو محض تعصب کہہ کر نہ ٹال دیں بلکہ ان کے تاریخی' نفسیاتی' سیاسی' معاشی اور بین الاقوامی پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی کوشش کریں۔

اسلام اور "مذہبی ریاست" Theocracy کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے بعض مفکرین مغرب کی جمہوریت کے تصور کو اسلامی روایت میں تلاش کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست دراصل ایک جدید رفاہی ریاست ہی ہے جو اسلام کو حد سے حد ریاستی مذہب قرار دیتی ہے۔ چنانچہ مغربی جمہوریت' مغربی سوشل سیکورٹی سسٹم بشمول معمر افراد کے خصوصی مکانات' پیشہ ور خواتین کے لیے اقامت گاہیں' وغیرہ ان کے خیال میں اسلامی فلاحی ریاست کے عناصر ترکیبی ہیں۔ ایک دوسرا طبقہ جو مذہبی ریاست سے یہ مفہوم لیتا ہے کہ مذہبی جماعتوں کے نمائندے حکومت کی ذمہ داریوں پر فائز ہو جائیں یہ سمجھتا ہے کہ اسلامی شریعت کی علاماتی تعزیرات کے نظام کو نافذ کر دیا جائے تو گویا مذہبی ریاست کا قیام عمل میں آجائے گا۔

مغربی اور مغرب زدہ مفکرین' یورپ میں کلیسا کے دور اقتدار میں ہونے والے ظلم و ستم کی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ تصور کرتے ہیں کہ اگر قرون وسطیٰ کے عیسائی ذہن سے ملتا ہوا کوئی مذہبی طبقہ برسر اقتدار آگیا تو گویا تین بڑے گناہوں کا ارتکاب ہو جائے گا: اولاً" عیسائیت کی تاریخ کی روشنی میں عقل کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور قرون وسطیٰ بلکہ قرون اسود کے طرز پر اندھے عقیدہ' تقلید محض اور روایت پرستی کو اختیار کر لیا جائے گا۔ ثانیاً" یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے قبل کے مذہبی طبقہ کی طرح اپنی روحانیت کے زعم پر منصب سیاست پر قابض ہو جانے والی مذہبی طبقاتی قیادت وجود میں آجائے گی۔ ثالثاً" یہ متشدد بلکہ مذہبی جنونی' مذہب کے نام پر عدل و انصاف' انسانی حقوق' حریت اور جمہوری اقدار کو پامال کرتے ہوئے ایک سفاک اور جابر سیاسی نظام کو قائم کر دیں گے۔ نتیجتاً" دنیا سے رواداری' امن' مذہبی آزادی' حقوق نسواں' ترقی اور علمی سرگرمی کا جنازہ اٹھ جائے گا۔

مغربی مفکرین اور ارباب سیاست خود یورپ میں عیسائیت کے تجربہ سے ماخوذ اس فکری وحشت کو بعض نظری شکوک واہام کی بنیاد فراہم کرتے رہے ہیں۔ مثلاً" اسلامی ریاست کو ایک Theocracy سمجھنا ہمارے خیال میں ایک بنیادی غلطی ہے۔ اسلامی ریاست کسی مذہبی طبقہ یا گروہ کے صاحب اختیار بن جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ان اصولوں پر مبنی سیاسی نظام کے قیام کا نام ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات اور خلافت راشدہ کی تاریخی مثال سے استنباط کیے گئے ہیں۔ ان میں اولین اصول ہر انسانی عقل اور قانون پر وحی الٰہی کی فوقیت کا بنیادی اصول ہے یعنی شریعت (قرآن و سنت) کی بالادستی۔ اسلامی ریاست کا یہ پہلا اصول ہی اسے Theocracy سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہاں فوقیت کسی مسلکی یا مذہبی طبقہ یا اس کے نمائندے کے حکم کی نہیں ہے بلکہ براہ راست کتاب و سنت کی ہے۔ اولی الامر صاحب اختیار و اقتدار فرد محض ایک نافذ کرنے والا کارندہ ہے اور صرف اس وقت تک صاحب اختیار ہے جب تک قرآن و سنت کو نافذ کرتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست دراصل ایک شورائی ریاست ہے جس میں تمام معاملات باہمی صلاح و مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ اس میں بادشاہت' آمریت یا کسی پیشہ ورانہ حزب اختلاف و حزب اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے' مزید یہ کہ اسلامی ریاست ایک انتخابی عمل کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے اور موروثی حکومت یا خاندانی اجارہ داری کے نظام کو مکمل طور پر رد کرتی ہے۔

اگر صرف ان تین بنیادی نکات کو سامنے رکھ لیا جائے تو تحریکات اسلامی کی دعوت تبدیلی اقتدار کو "مذہبی حکومت" Theocracy کے ساتھ غلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی مفکرین ہی نہیں

مغرب زدہ مسلمان دانشور بھی خلافت اور شوریٰ کی اصطلاحات سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کہیں اسلامی تحریکات کامیاب ہو گئیں تو ایوان عوام ہی میں نہیں حکومت کے دفاتر' پولیس' عدلیہ ہر جگہ الف لیلائی شخصیات مناصب پر فائز ہو جائیں گی۔اس افسانوی طرز فکر کا علاج صرف یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو آسان اور براہ راست طور پر مطالعہ کرکے دیکھا جائے' کہ وہ کہاں تک ان خدشات کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

مغربی مفکرین اسلامی ریاست کے حوالے سے ایک اور اہم فکری غلطی یہ کرتے ہیں کہ وہ اسے محض روایات Conventions اور Traditions کا مجموعہ تصور کرتے ہوئے اور دور حاضر کی بعض بادشاہتوں کو اسلام کی نمائندہ سمجھتے ہوئے اسلامی ریاست کے قیام کے مطالبہ کو جمہوریت کے لیے خطرے کی گھنٹی اور حریت فکر اور آزادی اجتماع کے لیے پیغام اجل سمجھتے ہیں۔

حقیقت واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام جس ترقی پسند اور جدید ریاست کی تعلیم قرآن و حدیث میں دیتا ہے وہ اجتہاد کے اصول کی علمبردار ہے۔ اسی لیے شارع اعظم صلی اللہ علیہ و سلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بناتے وقت انہیں جو منشور عطا فرمایا وہ روایت پرستی کا نہیں بلکہ اجتہاد کرنے کا اصول تھا۔

اسلامی تحریکات اور ان کی احیائی کوششوں کو اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو وہ فی الحقیقت اجتہادی تحریکات نظر آتی ہیں۔ یہ قانون' تعلیم' معیشت' معاشرت' سیاست غرض ہر میدان میں اجتہاد کی بنیاد پر جدید مسائل کا حل کرنا چاہتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ روایت پرست تبلیغی جماعت ہو یا وہ مذہبی جماعتیں جو اپنا تشخص اپنی مخصوص فقہی تعبیر اور مسلک سے وابستہ کرتی ہیں ہر محاذ پر تحریکات کے ساتھ اجنبیت کا رویہ اختیار کرتی ہیں حتیٰ کہ دین کی جامع تعریف کو کہ وہ سیاست' عبادت' معیشت و معاشرت کے درمیان کوئی خط تفریق نہیں کھینچتا اور جو تحریکات اسلامی کی دعوت کا پہلا نکتہ ہے' اپنی روایتی مذہب پرستی کے پیش نظر اجنبی تصور کرتی ہیں۔

مغرب اور اسلام کے علمی و ثقافتی تعامل کو زیادہ بامعنی اور تعمیری بنانے کے لیے جہاں بظاہر مغرب کو ایک لمبا سفر طے کرنا ہو گا وہاں خود مسلمان اہل علم کو اسلام کے بعض بنیادی تصورات اور تحریکات اسلامی کی دعوت کو معروضی طور پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مطالعہ کرنا ہو گا۔

اس کے ساتھ ساتھ مغرب کو بعض مسلمانوں کے ان اقدامات کو جو محدود روایت پرستی' جذباتیت یا فرقہ واریت پر مبنی ہوں الگ رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہو گا کہ اگر شمالی آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی باہمی جدل عیسائیت کی نمائندہ تصور نہیں کی جاتی تو طالبان سے

منسوب بعض متشدد تصورات کس طرح اسلام اور مسلمانوں کے نمائندہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ مغرب کو اس پہلو کا جائزہ بھی لینا ہو گا کہ جن جن مقامات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہاں مسلمان قوت کا استعمال کر رہے ہیں کیا ایسا تو نہیں ہے کہ وہ کشمیر ہو یا فلسطین' بوسنیا ہرزیگووینا ہو یا چیچنیا' برما ہو یا جنوبی تھائی لینڈ یا فلپائن ان تمام مقامات پر مسلمانوں کی جدوجہد کی اصل حیثیت حقوق انسانی کے تحفظ کے لیے ایک دفاعی جہاد کی ہے۔ ان تمام مقامات پر' جنہیں بار بار تشدد کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے' مسلمانوں کی حیثیت مظلوم افراد کی ہے جن پر دہشت گردی کے ذریعے بیرونی تسلط قائم کیا گیا' نتیجتاً" انہیں اپنی حریت کے لیے کوشش کرنی پڑی۔ مغرب حقوق انسانی کی علمبرداری کا دعوی جس طرح کرتا ہے اس کا تقاضہ تو یہی تھا کہ ان تمام تحریکات جہاد کو ان کے صحیح سیاق میں سمجھ کر پیش کیا جاتا لیکن شاید سطحی معلومات یا ابلاغی سازش کی بنا پر تمام تحریکات حریت کو اسلامی جہاد کا غیر واضح نام دے کر مغرب کے عام قاری کو خائف اور اسلام اور مسلمانوں سے دوری کی طرف لے جایا گیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی اہل فکر کو معروضیت کے ساتھ عالمی امن' حقوق انسانی' مذہبی رواداری' معاشی اور ثقافتی حقوق کے حوالے سے مسلمانوں پر عاید کردہ بہت سے الزامات کو نئے سرے سے زیر بحث لانا ہوگا تاکہ اکیسویں صدی باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے ان خدشات و تعصبات کی شدت میں کمی کی مثال بن سکے۔